# اسرائیل کے قیام کی تاریخ اور وجوہات

(خطبہ جمعہ فرمودہ یکم فروری ۱۹۹۱ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے فرمایا:۔

اسلام کی تاریخ بہت سی خوفناک غداریوں سے داغدار ہے اور اگر آپ حضرت محمد مصطفی ﷺ کے دور کے ابتدائی حصے کو چھوڑ کر جس میں خلفائے راشدین کا دور اور کچھ بعد کا عرصہ شامل ہے، باقی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے مسلمانوں ہی سے کچھ غدار حاصل کئے گئے ہیں اور کبھی بھی اس کے بغیر ملت اسلامیہ کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکا۔ اس تاریخ پر نظر ڈالیں تو غداریوں کی تعریف میں موجودہ جنگ سیاہ ترین حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے کیونکہ آج تک کبھی اتنی اسلامی مملکتوں نے مل کر ملت اسلامیہ کے مفاد کے خلاف ایسی ہولناک سازش نہیں کی یا اس میں شریک نہیں ہوئے۔ پس یہ جو موجودہ جنگ ہے اس کو اس دور میں آج کے مبصرین ان مسلمان ممالک کو پاگل بنانے کے لئے جو ان کے ساتھ شامل ہوئے جو کچھ چاہیں کہیں۔ لیکن کل مغربی دنیا کے محققین اور مؤرخین بھی یہی بات کہیں گے جو میں آج کہہ رہا ہوں کہ ان مسلمان ممالک نے ان اسلامی مفاد کے ساتھ حد سے زیادہ غداری کی اور اسلام دشمن طاقتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی ابھرتی ہوئی اسلامی مملکت کو تباہ کیا اور اس طرح ظلم کے ساتھ ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی۔ ابھی تک تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کوشش کی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کل کو کیا نتیجہ نکلے گا لیکن اگر خدانخواستہ یہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو کل کا مؤرخ یہی بات لکھے گا کہ جب انہوں نے کوشش کی تو یہ مسلمان ممالک پوری طرح اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مل کر ایک عظیم اسلامی مملکت کو تباہ

کرنے کے لئے شامل ہوئے اور ذرہ بھر بھی عدل یا رحم سے کام نہیں لیا اور ذرہ بھر بھی قومی حمیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس ضمن میں کچھ ممالک تو ایسے تھے جن سے مجھے یہی توقع تھی، ان کے متعلق یہی احتمال تھا کہ ایسا ہی کریں گے جن میں ایک سعودی عرب ہے اور ایک Egypt اس لئے کہ Egypt پہلے ہی عالمی دباؤ کے نیچے آ کر اور کچھ اپنا علاقہ واپس لینے کی خاطر اسرائیل کے ساتھ معاہدوں میں جکڑا جا چکا ہے اور اس وقت مغربی طاقتیں مصر کو کلیۃً اپنا حصہ سمجھتی ہیں۔ دوسرے Saudi Arabia جس کی عالم اسلام سے غداریاں ایک تاریخی نوعیت رکھتی ہیں۔ اس کا آغاز ہی غداری کے نتیجے میں ہوا اس کا قیام ہی غداری کے نتیجے میں ہوا۔ مسلسل انگریزی حکومت کا نمائندہ رہا یا امریکن مفاد کا نمائندہ رہا اور اسلام کے دو مقدس ترین شہروں پر قابض ہونے کی وجہ سے مذہب کا ایک جھوٹا سا دکھاوے کا لبادہ پہنے رکھا جس کے نتیجے میں بہت سی مسلمان مملکتیں اس بدنصیب ملک کے رعب میں آئیں اور محض اس لئے اس سے محبت کرتی رہیں اور پیار کا تعلق رکھتی رہیں کہ وہ اسے مکے اور مدینے کا یا دوسرے لفظوں میں محمد رسول اللہؐ اور خدا کا نمائندہ سمجھتی تھیں۔

اس ضمن میں میں نے بارہا بعض مسلمان ریاستوں کے نمائندوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ تم بڑے دھوکے میں مبتلا ہو میں سعودی عرب کی تاریخ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہابیت کی تاریخ سے خوب واقف ہوں۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ مکے اور مدینے کے میناروں سے جو آوازیں بلند ہوتی ہیں یہ اللہ اور رسولؐ کی آوازیں ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان میناروں پر صرف لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے ہیں اور مائیکروفون واشنگٹن میں ہیں اور ان مائیکروفونز پر بولنے والا اسرائیل ہے کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کسی لمبی چوڑی دلیل کی ضرورت نہیں کوئی انسان جو موجودہ حالات کا ذرا سا بھی علم رکھتا ہے یہ دوٹوک بات خوب جانتا ہے کہ سعودی عرب کلیۃً امریکہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور امریکہ کلیۃً اسرائیلی اقتدار میں داخل ہو چکا ہے اور اسرائیلی اقتدار کو عملاً اپنی پالیسیز Policies میں قبول کر چکا ہے۔ یہ ظاہری صورت ہے جو نظر آتے ہوئے بھی مسلمان ممالک اس صورت سے اندھے رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جماعت احمدیہ کو انتہائی جھوٹے اور غلیظ پروپیگنڈے کا نشانہ بنایا گیا کہ جماعت احمدیہ انگریز کی ایجنٹ ہے اس لئے جب مسلمان ممالک کے نمائندے ہم سے یہ

بات سنتے تھے تو وہ سمجھتے تھے شاید اپنے گلے سے بلا ٹال کر سعودی عرب پر پھینکتے ہیں اور اپنے انتقام لے رہے ہیں ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔اب دنیا کے سامنے یہ بات کھل کر آچکی ہے اور وہ سارے مولوی بھی جو ان سے پیسے لے کر، ان کا کھا کر احمدیوں کو کبھی یہودیوں کے ایجنٹ قرار دیتے تھے۔کبھی انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیتے تھے کھلے بندوں اب ان Saudians کو، سعودی حکومت کے سربراہوں اور سارے جوان کے ساتھ شامل ہیں ، وہابی علماء کو، سب کو ملا کر یہودی ایجنٹ اور مغربی ایجنٹ قرار دے رہے ہیں اور ان کے متعلق ایسی گندی زبان استعمال کر رہے ہیں کہ وہ تو ہمیں زیب نہیں دیتی لیکن جیسا کہ پاکستان کی گلیوں میں اسی قسم کی گفتگو ہوتی ہے، ایسی ہی آوازیں بلند کی جاتی ہیں آپ جانتے ہی ہیں۔ایسی ہی آوازیں انگلستان میں بھی سعودیت کے خلاف بلند ہوئیں اور دوسرے ممالک کے متعلق بھی یہی اطلاع آرہی ہے کہ اب تمام عالم اسلام ان کی حقیقت کو سمجھا ہے اس لئے ان سے کسی قسم کی غداری پر تعجب کی کوئی گنجائش نہ تھی۔یقین تھا کہ یہی کریں گے یہی ان کا طریق ہے، یہی ہمیشہ سے کرتے چلے آئے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ دور میں بعض ایسے ممالک نے بھی اسلام کے مفاد سے غداری کی ہے جن سے دور کی بھی توقع نہیں تھی اور اس میں بھی میں سمجھتا ہوں کہ امریکن دباؤ کے علاوہ سعودی دباؤ بھی اور سعودی اثر بھی بہت حد تک شامل ہے اور کچھ غربت کی مجبوریاں ہیں جن کے نتیجے میں بعض ملکوں نے اپنے ایمان بیچے ہیں۔جن ممالک سے کوئی دور کی بھی توقع نہیں تھی ان میں ایک پاکستان ہے، ایک ترکی ہے اور ایک شام ہے۔

پاکستان سے تو اس لئے مجھے توقع نہیں تھی کہ وہاں کی حکومت چاہے کتنی ہی امریکن نواز کیوں نہ ہو میں بحیثیت پاکستانی جانتا ہوں کہ پاکستانی عوام اور پاکستانی فوج کا مزاج یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ مغربی طاقتوں کے ساتھ مل کر کسی مسلمان ملک پر حملہ کریں یا اس حملے کا جواز ثابت کرنے کے لئے ان میں شامل ہو جائیں۔کسی قیمت پر پاکستانی مزاج اس بات کو قبول نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود موجودہ حکومت نے جب پوری طرح اس نہایت ہولناک اقدام کی تائید کی جو عراق کے خلاف اتحاد کے نام پر کیا گیا ہے تو میں حیران رہ گیا کہ یہ کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے لیکن الحمدللہ کہ دو تین دن پہلے پاکستان کی فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ نے اس غلط فہمی کو تو دور کر دیا کہ فوج کی تائید اس فیصلے میں شامل ہے چنانچہ انہوں نے کھلم کھلا اس سے بریت کا اعلان کیا ہے اور کہا

ہے کہ ہم ہرگز اس فیصلے کو پسند نہیں کرتے ۔ یہ غلط فیصلہ ہے اور ملت اسلامیہ کے مفاد کے خلاف ہے۔

جہاں تک Turkey کا تعلق ہے Turkey تو تمام دنیا میں مسلمان مفادات کے محافظ کے طور پر صدیوں سے اتنا نیک نام پیدا کئے ہوئے ہے کہ اسی نام سے یورپ میں یہ جانا جاتا تھا اور ترکی کی عثمانیہ حکومت سے مغربی طاقتیں بھی کانپتی تھیں اور جب بھی ترکی کا نام آتا تھا تو وہ سمجھتے تھے کہ جب تک یہ سلطنت قائم ہے اسلام کی سرزمین میں نفوذ کا ہمارے لئے کوئی موقعہ پیدا نہیں ہوسکتا، کوئی دور کا بھی امکان نہیں ۔ چنانچہ اتنی لمبی عظمت کی تاریخ کو ایک فیصلے سے اس طرح سیاہ اور بدزیب بنا دینا اور ایسے داغدار کر دینا یہ اتنی بڑی خودکشی ہے کہ تاریخ میں شاید اس کی کوئی مثال نظر نہ آئے۔ ترکی قوم پر ایسا داغ لگا دیا گیا ہے جواب مٹ نہیں سکے گا۔سوائے اس کے کہ کوئی عظیم انقلاب برپا ہو اور پھر وہ اپنے خون سے اس داغ کو دھونے کی کوشش کریں۔

جہاں تک Syria کا تعلق ہے اس کے لئے بھی کئی ایسی وجوہات تھیں جن کی بنا پر مجھے Syria یعنی شام سے ایسی توقع نہیں تھی ۔ایک تو حافظ الاسد کا اپنا گولان ہائیٹ (Height) کا علاقہ اسرائیل نے ہتھیایا ہوا ہے اور بڑی دیر سے ان کی اسرائیل سے مخاصمت اور لڑائی چلی آرہی ہے اور اس تاریخی دور میں جب سے اسرائیل کا قیام ہوا ہے Syria نے اسرائیل کی مخالفت میں بڑی قربانیاں پیش کی ہیں اور اپنے علاقے بھی گنوائے لیکن اپنے مؤقف کو تبدیل نہیں کیا۔اس کے علاوہ صدام کی جو تصویر مغربی قومیں آج کھینچ رہی ہیں اس سے بہت زیادہ بھیانک اور بدصورت تصویر صدر حافظ الاسد کی انہی قوموں نے کھینچ رکھی تھی اور اب تک وہی قائم ہے اس لئے بھی میں نہیں سوچ سکتا تھا کہ جب مغربی قومیں ایک طرف صدر صدام کو گندی گالیاں دیں گی اور اس کی کردار کشی کر رہی ہوں گی تو صدر حافظ الاسد کس طرح یہ سمجھیں گے کہ میں اس سے بچ کر ان کے ساتھ گلے مل سکتا ہوں لیکن ان کو یعنی صدر بش کو اور صدر حافظ الاسد کو میں نے اکٹھے ایک صوفے پر بیٹھے دوستانہ باتیں کرتے ہوئے ٹیلویژن پر دیکھا اور ان کی پالیسی کو یکسر اس طرح بدلتے دیکھا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے، کچھ سمجھ نہیں آتی ۔انسان ششدر رہ جاتا ہے کہ یہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ایران سے مجھے نہ توقع تھی، نہ ہے نہ ہوگی کیونکہ ایران کے متعلق پہلے بھی میں بارہا کھلم کھلا یہ اقرار کر چکا ہوں کہ مذہبی عقائد سے اختلاف کے باوجود ایرانی قوم اسلام کے معاملے میں منافقت نہیں کرتی ۔اسلام کی سچی عاشق ہے۔

ان کا اسلام کا تصور غلط ہوسکتا ہے یہ تو ہوسکتا ہے کہ شیعہ ازم میں بعض ایسے عقائد کے قائل ہوں جن سے ہم اتفاق نہیں کرتے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسلام کے تصور میں جہاں تک سیاست کا تصور ہے ان کے خیال میں بہت سی غلطیاں ہوں یعنی اسلام کے سیاسی تصور میں ان کے خیال میں غلطیاں ہوں اور ہیں میرے نزدیک لیکن جان بوجھ کر اسلام سے غداری کریں یہ ایرانی قوم سے ممکن نہیں ہے اوران کی تاریخ بھی خدمت اسلام کی عظیم کارناموں سے روشن ہے بلکہ جتنی علمی خدمت اسلام کی وسیع تر ایران نے کی ہے جس کا ایک حصہ اب روس کے قبضے میں ہے اس خدمت کو اگر باقی اسلام کی خدمت کے مقابل پر رکھیں تو آپس میں تول کرنا بہت ہی مشکل ہوگا ۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایران کی خدمت کسی طرح دوسری سب خدمتوں سے پیچھے رہ گئی ہے ۔ الحمدللہ کہ ایران نے اپنی توقعات کو پورا کیا اور باوجود اس کے کہ صدر صدام کی حکومت سے ایرانی حکومت کا شدید اختلاف تھا۔ آٹھ سال تک نہایت خوفناک خونی جنگ میں یہ لوگ مبتلا رہے ہیں اور بہت ہی گہرے شکوے اور صدمے تھے ۔ اگر ایران ،عراق کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا تو دنیا سمجھ سکتی تھی اور مؤرخ اس کو معاف بھی کرسکتا تھا کہ اتنی خوفناک جنگ کے بعد اگر ایران نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے تو کوئی حرج نہیں ایسا ہو جایا کرتا ہے ۔ آخر انسانی جذبات ہیں جو بعض باتوں سے مشتعل ہو کر پھر قابو میں نہیں آتے ۔ اس وقت انسان گہری سوچوں میں نہیں پڑسکتا کہ اسلام کے تقاضے کیا ہیں ، ملت کے تقاضے کیا ہیں ۔ جذبات میں بہہ جاتا ہے تو یہ باتیں سوچ کر ایک مؤرخ کہہ سکتا ہے کہ اس پہلو سے یہ قابل معافی ہے مگر ایران نے اگر چہ ساتھ شامل ہونے کا فیصلہ تو نہیں کیا لیکن اس ابتلاء میں پوری طرح نیوٹرل (Neutral) رہتے ہوئے عراق کو عراق کی غلطی یاد کرائی اور مغربی طاقتوں کو ان کی غلطی یاد کروائی گویا کہ انصاف پر قائم رہا۔ اس پہلو سے ایران کا نام انشاء اللہ اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔

یہ تو مختصر تبصرہ ہے سیاسی طور پر اسلام سے وفاداری یا عدم وفاداری کا جہاں تک تعلق ہے ۔ میں جب اسلام سے وفاداری یا عدم وفاداری کہہ رہا ہوں تو سیاسی معنوں میں کہہ رہا ہوں یعنی ملت اسلامیہ سے وفاداری یا عدم وفاداری کی بات ہو رہی ہے لیکن اس ضمن میں ایک یہ بات اور بھی بتانی چاہتا ہوں کہ ملت اسلامیہ میں دو ممالک ایسے تھے دو سلطنتیں ایسی تھیں جو مذہب کے لحاظ سے بھی

غیر معمولی مقام رکھتی تھیں۔اسلام کے مقدس مقامات کے محافظ کے طور پر اور اس کے مجاور اور نگران کے طور پر سعودی عرب کو دنیائے اسلام میں ایک عظیم حیثیت حاصل ہے جس سے کوئی انکار نہیں کیا جاسکتا یہ اس کی خوش نصیبی تھی کہ اتنی بڑی سعادت، اتنی بڑی امانت اس کے سپرد ہوئی اور دوسری طرف اسلامی علوم کا محافظ اور نگہدار مصر سمجھا جاتا تھا کیونکہ مصر کی جامعہ ازھر نے اسلامی علوم کی جو خدمت کی ہے اس کی کوئی مثال کسی اور اسلامی ملک میں دکھائی نہیں دیتی اور اسلام کے آخری دور میں علمی خدمت کے لحاظ سے جامعہ ازھر مصر کو جو پوزیشن حاصل ہے اس کا کوئی اور دنیا میں مقابلہ نہیں کرسکتا پس ان دونوں سے اس پہلو سے کوئی دور کی بھی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ یہ ملت اسلامیہ سے غداری کریں گے۔چنانچہ ان کا حال دیکھ کر مجھے وہ ایک شعر یاد آ جاتا ہے جو بچپن میں سنا ہوا تھا اور اس زمانے میں زیادہ اچھا لگا کرتا تھا مگر بعد میں درمیانہ سا لگنے لگا وہ یہ تھا کہ:

ؔ آگ دی صیاد نے جب آشیانے کو میرے
جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کہ جب ظالم شکاری نے میرے گھونسلے کو جلایا تو جن پتوں پر میرا ٹھکانہ تھا، میرا سرہانہ تھا، میرا تکیہ تھا وہی پتے ہل ہل کر اس میرے گھونسلے کی آگ کو ہوا دینے لگے۔تو علمی لحاظ سے اور تقدس کے لحاظ سے جن دو ملکوں پر عالم اسلام کا تکیہ تھا جب دشمن نے عالم اسلام کے آشیانے کو آگ دی ہے تو انہوں نے ہی اس آگ کو ہوا دی ہے۔پس یہ ایسا جرم نہیں ہے جو کبھی بھی تاریخ میں معاف کیا جاسکے گا۔اللہ تعالیٰ کی تقدیر کیا فیصلے کرتی ہے۔آج کرتی ہے یا کل کرتی ہے، اس دنیا میں کچھ دکھاتی ہے یا ان کی سزا جزا کا معاملہ آخرت تک ملتوی کر دیتی ہے یہ تو اللہ تعالیٰ مالک ہے وہی بہتر فیصلے کرسکتا ہے لیکن جہاں تک دنیا کی سمجھ بوجھ کا تعلق ہے اس کے بداثرات کچھ تو ظاہر ہو رہے ہیں کچھ ایسے ہیں جو مدتوں ہوتے رہیں گے اور صرف اس خطہ ارض میں محدود نہیں رہیں گے بلکہ بہت وسیع ہوں گے اور بہت پھیل جائیں گے۔

دوسرا پہلو اس جنگ کا یہ ہے کہ جس کو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ اس جنگ کا مقصد کیا ہے۔کیوں ہو رہی ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ جب تک ہم اس کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں اس وقت تک اس بارے میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ عالم اسلام کا صحیح مؤقف کیا ہونا چاہئے یا دنیا کا

مؤقف کیا ہونا چاہئے ۔United Nations کو اس بارہ میں کیا اصلاحی اقدامات کرنے چاہئیں ۔مرض کا جب تک تجزیہ ہی نہ ہو، تشخیص ہی صحیح نہ ہو اس وقت تک صحیح علاج تجویز ہو ہی نہیں سکتا۔اس لئے میں باقی خطبے میں مختصراً اس جنگ کی وجوہات کا اور اصل محرکات کا اور مقاصد کا تجزیہ کرنے کی کوشش کروں گا تا کہ اس کی روشنی میں پھر آئندہ انشاء اللہ ایسی تجاویز پیش کروں گا جو United Nations کیلئے بھی ہوں گی اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے بھی اور عالم اسلام کے لئے بھی کہ احمدیہ نقطہ نگاہ سے بھی ان مسائل کا کیا حل ہے اور آئندہ دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے اگر سنجیدگی سے غور ہونا چاہئے تو کس پہلو سے، کس طریق پر غور ہونا چاہئے ۔

اس وقت تو ہم مغرب سے یہی آواز سن رہے ہیں اور صدر بش اس آواز کو سب سے زیادہ زور سے اور شور کے ساتھ دنیا میں پیش کر رہے ہیں کہ یہ جنگ مذہبی جنگ نہیں ہے ۔ یہ جنگ کسی قسم کے مفادات سے تعلق نہیں رکھتی یہ تیل کی جنگ نہیں ہے ۔ یہ ہمارے مفادات کی جنگ نہیں، یہ اسلام کی جنگ نہیں ہے یہ یہودیت کی جنگ نہیں ہے یہ عیسائیت کی جنگ نہیں ہے ۔ پھر یہ کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں یہ حق اور انصاف کی جنگ ہے، یہ سچ اور جھوٹ کی جنگ ہے، یہ نیکی اور بدی کی جنگ ہے، یہ تمام دنیا کی جنگ ہے، ایک ظالم اور سفاک شخص صدام کے خلاف ۔ یہ وہ امریکہ نظریہ ہے جس کو اس کثرت کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات میں مشتہر کیا جا رہا ہے کہ اکثر مغربی دنیا اس کو تسلیم کر بیٹھی ہے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ واقعی یہی جنگ ہے لیکن بہت سے منصف مزاج اور گہری نظر رکھنے والے مبصرین ہیں جو انکار کر رہے ہیں اور مغرب ہی کے مبصرین کی میں بات کر رہا ہوں۔ان میں بڑے بڑے ماہر اور تجربہ کار سیاستدان بھی ہیں اور دانشور 'صحافی' ہر قسم کے طبقے سے کچھ نہ کچھ آوازیں یہ بلند ہو رہی ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے ۔ یہ سب پروپیگنڈہ ہے اور ہمیں ہمارے ہی راہنما دھوکے دے رہے ہیں اور کھلے کھلے دھوکے دے رہے ہیں ۔ یہ جنگ کچھ اور ہے ۔ایڈورڈ ھیتھ Adward Heith جو انگلستان کے پرائم منسٹر رہ چکے ہیں اور اپنی بصیرت کے لحاظ سے اور بصارت کے لحاظ سے اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے اور سیاست کے وسیع تجربے کے لحاظ سے انگلستان کی عظیم ترین زندہ شخصیتوں میں شامل ہوتے ہیں اور مسلسل ان کا یہی مؤقف رہا ہے کہ ہماری موجودہ سیاسی لیڈر شپ ہمیں سخت دھوکا دے رہی ہے اور یہ جو نیک مقاصد کا اعلان کیا جا رہا ہے ہرگز یہ بات نہیں ۔ یہ جنگ انتہائی خود

غرضانہ اور ظالمانہ جنگ ہے اور احمقانہ جنگ ہے کیونکہ ان کے نزدیک بھی اس کے نہایت ہی خوفناک بداثرات پیدا ہوں گے اور جنگ کے بعد کے حالات بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔

بہر حال اس وقت میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ مغربی مفکرین کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ خلاصۃً دوسری آواز یہ ہے کہ یہ تیل کی جنگ ہے یہ مفادات کی جنگ ہے یہ اسرائیل کے دفاع کی جنگ ہے اسرائیلی مقاصد کو پورا کرنے کی جنگ ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ جنگ صدر بش کی اور صدر صدام کی جنگ ہے اور ان کے نزدیک صدر بش نے اس مسئلے کو اپنی ذاتی اَنا کا مسئلہ بنالیا ہے اور اب ان کی عقل اور ان کے جذبات ان کے قابو میں نہیں رہے۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں اور اس طرح بچوں کی طرح ایسے غلط محاورے استعمال کرتے ہیں کہ یہ لگتا ہی نہیں کہ کوئی عظیم قومی راہنما بات کر رہا ہے اس لئے وہ بڑے زور کے ساتھ اس مسلک کو پیش کرتے ہیں کہ یہ جنگ دراصل صدر بش کی جنگ ہے جو صدر صدام سے شدید نفرت کرتے ہیں اور انہوں نے امریکن تسلط کو قبول کرنے سے جو انکار کیا اور اس کے رعب میں آنے سے انکار کیا اس کے نتیجے میں غضب بھڑکا ہوا ہے جو قابو میں نہیں آرہا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے کیونکہ جماعت احمدیہ کو تو جذباتی فیصلے نہیں کرنے چاہئیں اور چونکہ ہم نے صرف اپنی ہی فکر نہیں کرنی بلکہ سب دنیا کی فکر کرنی ہے۔ کمزور اور چھوٹے اور بے طاقت ہونے کے باوجود کیونکہ ہم میں سے ہر ایک یہ یقین رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس دنیا کی سرداری یعنی خدمت کے رنگ میں ہمارے سپرد فرمائی ہے۔ ہمیں اس دنیا کا قائد بنایا گیا ہے اور قائد کا معنی وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ **سید القوم خادمھم** (الجہاد لابن المبارک کتاب الجہاد حدیث نمبر: ۲۰۷) کہ قوم کا سردار اس کا خادم ہوا کرتا ہے۔ یعنی سردار اور خادم دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اگر کوئی خدمت کرنا نہیں جانتا تو وہ سیادت کا حق نہیں رکھتا اور اگر وہ کوئی سیادت پاجاتا ہے تو اس کا فرض ہے کہ خدمت کرے۔ پس ان معنوں میں میں قائد ہونے کی بات کرتا ہوں اور کسی معنی میں نہیں۔ پس ہم نے بنی نوع انسان کی خدمت کرنی ہے۔ ان کو ان کے صحیح اور غلط کی تمیز سکھانی ہے اور ان کو سمجھانے کی کوشش کرنی ہے کہ تمام بنی نوع انسان کا مفاد کس بات میں ہے۔ کس چیز میں ان کی بھلائی ہے کس چیز میں ان کی برائی ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کو

خوب کھولوں اور پھر جہاں جہاں احمدی اس مسئلے کو سمجھ لیں وہاں پھر وہ اپنی طاقت کے مطابق آواز اٹھائیں اور ماحول کی سوچ اور آراء کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔

اس مسئلے کا آغاز دراصل پچھلی صدی کے آخر پر ہو چکا تھا۔ جو جنگ آج نظر آرہی ہے اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ 1897ء میں ایک صیہونی مقاصد کی کونسل قائم ہوئی جو یہود کے اس طبقے سے تعلق رکھتی تھی جو حضرت داؤد کی بادشاہت کے قائل ہیں اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام دنیا پر ایک دن داؤدی حکومت ضرور قائم ہو کر رہے گی۔ ان کو صیہونی یا اسرائیلی کہا جاتا ہے۔ صیہونیوں کی ایک ورلڈ کونسل قائم ہوئی اور اس نے اپنا ایک ڈیکلریشن ظاہر کیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی سال یا اس سے کم و بیش کچھ آگے پیچھے کے عرصہ میں ایک یہودی Document یعنی مسودہ پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے ظاہر ہوا جس کا نام تھا پروٹوکالز آف ایلڈرز آف زائن (Protocols of Elders of Zion) یعنی زائن، وہی زائن (Zion) جس کا میں ذکر کر رہا ہوں یعنی اسرائیلی حکومت، زائن ازم کے قیام کا مظہر یہ لفظ زائن ہے۔ زائن وہ پہاڑ ہے جس کے اوپر کہتے ہیں حضرت داؤدؑ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ بہر حال جب زائن کہتے ہیں تو مراد اسرائیل ہے تو اسرائیل کے بڑے لوگ جو Zionism کے قائل ہیں ان کے چوٹی کے راہنماؤں کی سکیم کہ ہم کس طرح دنیا پر اپنے تسلط کو قائم کریں گے اور اس کے لئے لائحہ عمل کیا ہوگا کن اصولوں پر ہم کام کریں گے۔ کیا ہمارے مقاصد ہوں گے۔ کیا کیا طریق اختیار کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو مجھے اب تاریخ تو یاد نہیں لیکن یہ یقینی طور پر یاد ہے کہ انیسویں صدی کے آخر پر 1897ء کے لگ بھگ پہلی مرتبہ یہ Document ایک روسی عورت کے ہاتھ لگا جو دراصل ان Elders of zion، جن کی یہ سکیم تھی ان کے سیکرٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔ جرمنی میں یہ واقعہ ہوا ہے اور ان میں سے ایک کی دوست بھی تھی چنانچہ ایک دفعہ وہ رات کو اپنے دوست کے گھر اس کا انتظار کر رہی تھی اور اس کو دیر ہوگئی اس نے اس کی میز پر پڑی ہوئی کتابوں میں سے ایک مسودہ دیکھنے کے لئے، دل بہلانے کے لئے چن لیا اور یہی وہ مسودہ ہے جس کا نام ہے Protocol Of Eleders Of Zion اس مسودے کو پڑھ کر وہ ایسی دہشت زدہ ہوئی اور اس میں دنیا کو فتح کرنے کا ایسا خوفناک منصوبہ تھا کہ وہ اس کو لے کر بھاگ گئی اور روس چلی گئی اور پہلی مرتبہ اس کتاب کو روس میں شائع کیا گیا پھر 1905ء

میں پہلی مرتبہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔تو بہر حال یہ وہی دور ہے کہ جب ایک طرف انہوں نے ایک مخفی منصوبہ تیار کیا اور دوسری طرف ایک ظاہری منصوبے کا اعلان کیا اور یہ جو ظاہری منصوبہ ہے اس کے متعلق کوئی Controversy نہیں ہے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ ہاں ہمارا منصوبہ تھا اور ہم نے دنیا میں اس کو ظاہر کیا ہے۔ وہ صرف اتنا تھا کہ حکومتوں کے تعلقات کے لحاظ سے ،دوسرے اثرات کو بڑھانے کے لحاظ سے ہم ایک منظّم جدوجہد کریں گے جس کا مقصد یہ ہوگا کہ اسرائیل کو اپنا ایک الگ گھر بطور ریاست کے مل جائے۔تو جو دوسرا منصوبہ تھا اس کا مقصد تھا کہ اسرائیل United Nations کے ذریعے اور اس زمانے میں اگر چہ United Nations کا کوئی تصور بھی موجود نہیں تھا لیگز آف نیشنز بھی نہیں تھیں ،اس کے باوجود اس منصوبے میں یہ سب کچھ ذکر موجود ہے اور اس سکیم کے ذکر کے بعد وہ منصوبہ آخر یہ ارادہ ظاہر کرتا ہے کہ جب یہ ساری باتیں ہو جائیں گی۔ہم United Nations قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں گے تو پھر ہم United Nations پر قبضہ کریں گے اور United Nations پر قبضے کے ذریعے پھر ساری دنیا پر حکومت ہوگی تو یہ United Nations پر قبضہ کرنے کا اور اس کے ذریعے پھر آگے دنیا پر حکومت کرنے کا جو منصوبہ تھا اس میں بہت سالوں کا لگنا ایک طبعی امر تھا لیکن جس مرحلے کا اس میں ذکر ہے کہ ان ان مراحل کو طے کر کے ہم بالآخر اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے وہ تمام مراحل اسی طرح وقتاً فوقتاً طے ہوتے رہے۔ چنانچہ جب یہود نے اس منصوبے سے قطع تعلقی کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ ہماری طرف منسوب کیا گیا ہے ہمارا منصوبہ نہیں ہے تو اس پر دنیا کے علماء اور سیاستدانوں اور دانشوروں نے بڑی بڑی بحثیں اٹھائیں۔کئی عدالتوں میں اس پر مقدمہ بازیاں ہوئیں۔انگلستان کے ایک پروٹسٹنٹ نے اس پر بہت تحقیق کی ہے اور اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے Water Flowing Eastwards اس کتاب میں اس کے سارے پہلوؤں پر بحث ہے۔ مجھے آج تقریباً 20 سال پہلے اس کو پڑھنے کا موقعہ ملا تھا۔اس کے بعد کوئی دوست مانگ کر لے گئے اور پھر وہ ہاتھوں ہاتھ بکھر کے پتا نہیں کہاں چلی گئی۔انگلستان سے میں نے کوشش کی ہے لیکن وہ دستیاب نہیں ہوتی کیونکہ اس کتاب میں یہ بھی ذکر ہے کہ اس کتاب کو یہود فوراً مارکیٹ سے غائب کر دیتے ہیں۔ یہ درست ہے یا غلط کہ یہود کرتے ہیں یا کوئی اور کرتا ہے مگر ہو ضرور غائب

جاتی ہے یہ تو ہمارا تجربہ ہے۔ پس معین طور پر الفاظ تو میں بیان نہیں کر سکتا لیکن جو بات میں بیان کرتا ہوں۔ بنیادی طور پر مضمون کے لحاظ سے درست ہے۔ چنانچہ اس میں اس نے لکھا ہے جب انگلستان کے پرائم منسٹر، غالباً ڈزرائیلی نام تھا، ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک یہ مسودہ جو یہود کی طرف منسوب کیا جاتا ہے واقعۃً بڑے یہودی آدمیوں کی تحریر ہے اور ان کا منصوبہ ہے یا ان کے خلاف محض ایک سازش ہے اور ان کو بدنام کرنے کی کوشش ہے تو اس کا جواب ڈزرائیلی نے یہ دیا کہ میرے نزدیک صرف دو صورتیں ممکن ہیں یا تو یہ منصوبہ واقعۃً انہی لوگوں کا ہے جن کی طرف منسوب ہو رہا ہے کیونکہ اس کے بعد جتنے واقعات رونما ہوئے ہیں وہ بعینہٖ اس منصوبے کے مطابق ہوئے ہیں اس لئے از خود کس طرح وہ واقعات رونما ہونے لگے اور اسی ترتیب کے ساتھ، اسی تفصیل کے ساتھ اور یا پھر یہ کسی نبی کی کتاب ہوگی جس نے خدا سے علم پا کر اتنی زبردست پیشگوئی کی ہوگی۔ تو اس نے کہا میرے نزدیک تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو پرلے درجے کے جھوٹوں کی ہے جنہوں نے منصوبہ بنایا اور اب انکار کر رہے ہیں اور یا پھر ایک بہت بزرگ اور سچے کی کتاب ہے جس کو خدا نے بتایا تھا کہ آئندہ یہ واقعات ہوں گے۔

آج ہم جس دور میں داخل ہوئے ہیں یہ اس کی تکمیل کے آخری مراحل کا دور ہے۔ جب روس اور امریکہ کے درمیان مفاہمتیں شروع ہوئیں اور برلن کی دیوار گرنی شروع ہوئی تو مجھے اس وقت یہ منصوبہ یاد آیا۔ اگرچہ میرے پاس موجود نہیں تھا کہ میں اپنی Memory، اپنی یادداشت کو تازہ کر سکتا مگر اتنا مجھے یاد ہے کہ اس کے آخر پر یہی لکھا ہوا تھا کہ بالآخر ہم پھر ساری دنیا کو پہلے تقسیم کریں گے اور پھر اکٹھا کر دیں گے اور اس وقت یہ ہوگا جب ہمارا United Nations پر پوری طرح قبضہ ہو چکا ہوگا۔ تو اس وقت سے میرا دل اس بات پر دھڑک رہا تھا کہ اب وہ خطرناک دن آنے کا زمانہ معلوم ہوتا ہے آ گیا ہے لیکن اس خوف کے باوجود جو اتنی بڑی بڑی علامتوں کے ظاہر ہونے کے بعد ایک طبعی امر ہے مجھے ایک یہ بھی کامل یقین ہے کہ بالآخر یہ منصوبہ ضرور ناکام ہوگا اور میرا یہ اعلان حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک الہام کی بناء پر ہے 1901ء میں حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ الہام ہوا کہ:

''فری میسن مسلط نہیں کئے جائیں گے'' (تذکرہ صفحہ:۳۳۶)

اور 1905ء میں انگریزی میں یہ منصوبہ دنیا کے سامنے آیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فری میسن مسلط کئے جائیں گے۔ پس اس زمانے میں جبکہ فری میسنز کا کسی کو تصور بھی نہ تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ الہام ہونا یعنی ہندوستانی میں تو ''فری میسنری'' کا بہت کم لوگوں کو پتا تھا اور پھر قادیان جیسے گاؤں میں اچانک یہ الہام ہو جانا حیرت انگیز بات ہے پس مجھے کامل یقین ہے کہ بالآخر یہ منصوبہ ضرور ناکام ہوگا مگر ناکام ہونے سے پہلے دنیا میں نہایت ہی خطرناک زہر پھیل چکا ہوگا۔ بہت سے آتش فشاں پھٹ چکے ہوں گے اس کے نتیجے میں بہت سے زلازل واقعہ ہو چکے ہوں گے۔ بہت سی تباہیاں آئیں گی۔ بہت سی مصیبتوں میں قومیں مبتلا ہوں گی۔ بہت بڑے خطرناک دن ہیں جن سے ہمیں گزرنا ہوگا کیونکہ اتنا بڑا منصوبہ اچانک خود بخود ناکام نہیں ہوا کرتا۔ پوری کوشش کے بعد یہ منصوبہ اپنے سارے پر پرزے نکالے گا اور اس کی ناکامی کے لئے خدا کی تقدیر جو مدافعانہ کوشش کرے گی وہ بہرحال غالب آئے گی لیکن اس دوران ہمیں ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار ہونا چاہئے کہ بنی نوع انسان بہت بڑے بڑے ابتلاؤں میں سے گزریں گے اور انسان کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا اور اس میں سے کچھ حصہ لازماً احمدیوں کو بھی ملے گا کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ قومی عذابوں اور ابتلاؤں کے وقت سچوں کی جماعت کلیۃً بچ جائے۔ تکلیف میں کچھ نہ کچھ ضرور حصے دار ہوتی ہے لیکن یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بالآخر اسلام کی ترقی اور فتح اور احمدیت کے غلبے کے دن آئیں گے یہ وہ آخری تقدیر ہے جو لازماً ظاہر ہوگی اور وہی دراصل دنیا کا ''نظام نو'' ہے وہ نظام نو نہیں ہے جو صدر بش کے دماغ میں ہے جسے وہ New World Order کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں مگر اس مضمون کو سردست چھوڑتے ہوئے میں واپس وہاں آتا ہوں کہ سب سے پہلے موجودہ حالات کی بنیاد 1897ء کے لگ بھگ رکھی گئی۔ ظاہری طور پر تو بہرحال 1897ء میں رکھی گئی جب اسرائیل کی حکومت کے قیام کی کوششوں کا اعلان ہوا۔

اس کے بعد دوسرا بڑا قدم 1917ء میں ہمیں نظر آتا ہے جبکہ بالفور Balfour نے، (بالفور یا بیلفور جو بھی Pronunciation صحیح ہے)، جو انگلستان کے Foreign Secretory تھے، انہوں نے ایک بہت امیر یہودی انسان کو جو یہودی کمیونٹی کا نمائندہ تھا، راتشیلڈ Rothschild جو بعد میں لارڈ (Lord) بھی بن گیا یا اس وقت بھی شاید Lord ہی ہو، Lord

Rothschild کو ایک خط لکھا جس میں کیبنٹ کے ایک فیصلے سے اس کو مطلع کیا اور یہ Document کے طور پر چھپا ہوا موجود ہے کہ برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ فلسطین میں اسرائیلیوں کو گھر دینے کے مسئلے پر ہر طرح تعاون کریں گے اور ہر طرح آپ کا ساتھ دیں گے اور ہاتھ بٹائیں گے۔ یہ جو 16'17'18'19 تک کے عرصے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور اسلام کے خلاف سازشوں کا ایک نہایت ہی خوفناک اور سنگین دور ہے اور ان سازشوں میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ اس وقت کی برطانوی حکومت نے لیا۔ میں اس کی چند مثالیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

1897ء میں First World Zionist Congress نے جو ڈیکلریشن دیا اس کا میں ذکر کر چکا ہوں جس کے اس وقت پریذیڈنٹ DR. Theodor Herzl تھے اور اگست 1897ء میں یہ منصوبہ دنیا میں باقاعدہ شائع ہوا۔ 1917ء کو بالفور Balfour برٹش فارن سیکرٹری نے راتشیلڈ کو جو خط لکھا ہے اس کا میں ذکر کر چکا ہوں ۔اس سے ایک سال پہلے 1916ء میں MR. Mc Mahon جو انگلستان کی حکومت کے نمائندہ تھے انہوں نے مکہ اور مدینہ اور ارض حجاز کے گورنر شریف حسین صاحب کو ایک خط لکھا۔ یہ شرق اردن کا خاندان تھا جو ترکی کی طرف سے ارض حجاز پر ترکی کی نمائندگی کرتا تھا اور اس خاندان کے افراد کو شریف مکہ کے طور پر یعنی مکہ کے گورنر کے لقب کے ساتھ وہاں گورنر بنایا جاتا تھا تو شریف مکہ کو Mc Mahon نے ایک خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم اس بات پر ہم سے اتفاق کرلو کہ ہم تمہیں ترکی کی ظالمانہ حکومت سے آزادی دلائیں اور آزاد عرب ریاست کے قیام میں تمہاری مدد کریں تو اس کے بدلے تم ہمیں یہ یہ مراعات دو۔ کچھ علاقے A کے نام سے Mark کر کے نقشے میں ظاہر کئے گئے کچھ B کے نام سے اور کچھ فرانسیسی تسلط کے علاقے بتائے گئے، کچھ انگریزی تسلط کے۔ان ساری شرائط کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے فارن پالیسی بنانے کا پورا اختیار انگلستان کو ہوگا یا فرانس کو ہوگا اور تمہیں اپنے بیرونی معاملات طے کرنے میں ان ان دائروں میں جن جن حکومتوں کا تسلط ہے ان کے مشورے اور اجازت کے بغیر کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی یہاں تک کہ کوئی یورپین مبصر اور کوئی یورپین مشیر تم وہاں سے نہیں بلا سکتے جب تک انگریزی تسلط کے علاقے میں انگریز سے اجازت نہ ملے یا

فرانسیسی تسلط کے علاقے میں فرانس سے اجازت نہ ملے۔ ادھر ان سے یہ گفت وشنید ہو رہی تھی یعنی شریف مکہ سے اور ادھر وہابی حکومت کے سربراہ یعنی سعودی خاندان سے ساز باز چل رہی تھی کہ اگر تم ہم سے یہ معاہدہ کرو کہ اس علاقے پر ہمیشہ کے لئے انگریزی تسلط کو قبول کر لو گے اور انگریز کی مرضی کے بغیر کوئی فارن پالیسی طے نہیں ہوگی اور ترکی کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمارا ساتھ دو گے اور بہت سی شرطیں تھیں تو ہم تمہاری مدد کریں گے کہ تم ارض حجاز پر قابض ہو جاؤ اور تمہاری حکومت کی ہمیشہ حفاظت کا تم سے اقرار کریں گے اور تمہیں تحفظ دیں گے کہ کبھی کوئی تمہیں میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔ اور یہ معاہدہ ان کے ساتھ طے پا گیا اور چند سالوں کے بعد باقاعدہ اسی طرح حملہ ہوا اور پھر انہوں نے شریف مکہ کو الگ کر دیا تو 1915ء، 16، 17 کے زمانے میں ایک طرف شریف مکہ سے یہ باتیں ہو رہی تھیں دوسری طرف شریف مکہ کے مخالفین سے وہ باتیں ہو رہی تھیں اور تیسری طرف روس اور انگلستان اور فرانس، ان تینوں کا 1916ء میں عثمانی حکومت کا آپس میں بانٹنے پر ایک معاہدہ ہوا اور اس میں یہ باتیں طے ہوئیں کہ جب ہم عثمانی حکومت کو ٹکڑے ٹکڑے کریں گے تو کون سا حصہ روس اپنے قبضے میں کرے گا کون سا فرانس اپنے قبضے میں کرے گا کون سا انگریز اپنے قبضے میں کریں گے اور اس کے علاوہ ایک Englo French Agrement ہوا جس میں عرب کی بندر بانٹ کے متعلق انگریزوں اور فرانسیسیوں کا آپس کا معاہدہ تھا۔

پس اس علاقے پر تین بڑی طاقتوں کا تسلط بطور منصوبے کے اس زمانے میں طے ہو چکا تھا اور جہاں عرب کا تعلق ہے۔ یہاں روسی عمل دخل کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ عرب علاقوں پر فرانس اور انگلستان کی اجارہ داری تسلیم کی جا چکی تھی۔ پس بعد میں جو جنگیں ہوئیں اور بعد میں ان دونوں قوموں نے جو کردار یہاں ادا کیا ہے وہ اس پس منظر میں سمجھنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ پس اس پہلو سے جب ہم موجودہ صورتحال کا تجزیہ کرتے ہیں تو مقاصد کو سمجھنا نسبتاً زیادہ آسان ہو جاتا ہے لیکن اس بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک ایسی Mystery کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ان مسائل سے گہرا تعلق رکھتی ہے دو ایسی باتیں ہیں جو عام طور پر انسان توقع نہیں رکھتا کہ ہوں گی لیکن ہوئی ہیں ایک بات یہ ہے کہ مشرق وسطی دنیا کا امیر ترین علاقہ ہے اور دنیا کے سارے تیل کا ۶۰ فیصد اس علاقے میں پیدا ہوتا ہے اس کے باوجود اپنی دفاع کی طاقت کے لحاظ سے دنیا کا کمزور ترین علاقہ ہے

اور انڈسٹریل Growth کے لحاظ سے دنیا کا کمزور ترین علاقہ ہے۔ پس یہ کیا مسئلہ ہے کیا معمہ ہے کہ جہاں دولتوں کے پہاڑ ہوں وہاں پہریدار کوئی نہ ہوں۔ یہاں کسی بینک میں سونے کی کچھ ڈلیاں بھی ہوں تو حفاظت کے بڑے پکے انتظام ہوا کرتے ہیں لیکن وہاں تو واقعۃً سونوں کے پہاڑ پیدا ہورہے ہیں اور اس کے باوجود فوجی نقطہ نگاہ سے ایک خلاء کا علاقہ سمجھا جاتا ہے جو طاقت آپ دیکھ رہے ہیں اس کی اس دولت سے درحقیقت کوئی نسبت نہیں ہے جو وہاں موجود ہے تو کیوں ایسا ہورہا ہے کیوں اس علاقے کو کمزور رکھا گیا ہے جبکہ اسرائیل جو اس علاقے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جس میں تیل کی دولت نہیں ہے۔ اس کو غیر معمولی طور پر طاقتور بنایا گیا ہے۔ پس جہاں مال پڑا ہے وہ حصہ کمزور ہے۔ جہاں ڈاکے کا خطرہ ہے اس حصے کو طاقت دے دی گئی ہے۔ ایک یہ معمہ ہے جو حل ہونے والا ہے۔

دوسرا معمہ یہ ہے کہ صدر صدام نے جب Linkage کی پیش کش کی تو Linkage کی پیشکش کو کیوں رد کیا گیا جب ہم اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو حیران ہو جاتے ہیں کہ کیوں اس پیش کش کو رد کیا گیا ہے جب آپ اس کو پوری طرح سمجھ جائیں گے تو پھر آخری حل کیا ہونا چاہئے؟ وہ بات بھی آپ کو سمجھ آجائے گی۔ امریکہ نے اور اس کے اتحادیوں نے مسلسل انکار کیا کہ کویت پر قبضے کا جہاں تک تعلق ہے اس کا کوئی Linkage نہیں ہے۔ صدر صدام حسین کہتے تھے کہ اس کا Link ہے اور دونوں کو اکٹھا طے کرو۔ اگر یہ Link تسلیم ہو جاتا تو اس کے نتیجے میں اس مسئلے کا یہ حل بنتا کہ صدر صدام نے کویت کے علاقے میں جو جارحیت کی ہے اس علاقے کو چھوڑ کر اپنی جارحیت کے قدم کو واپس لے لے اور یہود نے، Zionists نے جو شرق اردن کے مغربی کنارے کو غصب کیا ہے اور وہاں اس کے خلاف جارحانہ پیش قدمی کی ہے وہ اپنے قدموں کو وہاں سے واپس ہٹالے۔ ایک جارحیت کو کالعدم کرو، دوسری جارحیت کو کالعدم کرو۔ دونوں طرفیں برابر ہو جاتی ہیں اور انصاف قائم ہو جاتا ہے یہ معاملہ آگے نہیں بڑھتا۔ یہ دراصل مقصد تھا صدر صدام کا جو بار بار Linkage کے اوپر زور دیتے چلے جارہے تھے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں نے جن کا اس مسئلے سے تعلق ہے اس کو کچھ اور رنگ میں، عمداً غلط رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور دنیا کی رائے عامہ کو دھوکا دینے کی کوشش کی حالانکہ صدر صدام کا مؤقف وہی تھا جو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

مغربی دنیا نے Linkage کو اس طرح عمداً غلط سمجھا کہ گویا صدر صدام یہ کہہ رہے ہیں کہ چونکہ اسرائیل نے ہمارے ایک مسلمان بھائی ملک کے کچھ علاقے پر قبضہ کرلیا ہے اس لئے اس غصے میں میں نے بھی اپنے ایک مسلمان بھائی کے علاقے پر قبضہ کرلیا ہے اور دونوں ایک ہی جیسے معاملات ہیں۔ حالانکہ اس میں کوئی منطق نہیں ہے اور انہوں نے اسی وجہ سے اس Linkage کے مؤقف کا مذاق اڑایا اور اس کو بالکل بودا اور بے معنی قرار دیا اور کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سب دنیا جانتی ہے کہ تیل کے جھگڑے کے نتیجے میں، یعنی تیل کا جھگڑا ان معنوں میں کہ کویت کی تیل کی فروخت کی جو پالیسی ہے اس سے عراق کو اختلاف تھا اور کچھ اور ایسے مسائل تھے تو تیل کے جھگڑوں کے نتیجے میں یا کچھ اور جھگڑوں کے نتیجے میں عراق نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں کویت پر قابض ہوجاؤں گا اور وہ جھگڑے دراصل بہانے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کویت کی تیل کی دولت پر قبضہ کرے تو کہتے ہیں اس میں Linkage کہاں سے ہوگیا۔ ان دونوں باتوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے حالانکہ جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم جارحیت کے خلاف ہو تو تم اس جارحیت کو کالعدم کرو جو پہلے اس علاقے پر ہوچکی ہے، میں بھی کالعدم کردیتا ہوں۔ بات ختم ہوجائے گی لیکن اس کی طرف آتے نہیں تھے۔ تو کیوں نہیں آرہے تھے یہ آخر کیا وجہ ہے؟ اسرائیل سے کیوں اتنا گہرا تعلق ہے؟ کیا رشتے داریاں ہیں؟ کیا اس کے مفادات کی غلامی کی ضرورت ہے؟ اور اس کے بدلے اتنی بڑی بڑی قیمتیں ادا کررہے ہیں کہ انسان کے تصور میں بھی ان قیمتوں کی کمیت پوری طرح داخل نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک بلین کی کمیت کیا ہے۔ ہم جیسے عام غرباء تصور بھی نہیں کرسکتے کہ ایک بلین کتنی بڑی رقم ہوتی ہے۔ ایک بلین روپے بھی ہمارے لئے بہت ہیں لیکن ایک بلین ڈالر تو بہت بڑی رقم ہے۔ اس جنگ میں جو اعداد و شمار ظاہر ہوئے ہیں، صرف امریکہ کا ایک بلین روزانہ خرچ ہورہا ہے ایک بلین ڈالر کا مطلب ہے ایک ارب ڈالر اور جتنے دن یہ جنگ چلے گی یہ اسی طرح خرچ ہوتا چلا جائے گا اور اس کے علاوہ انگریزوں کا خرچ ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسوں کا خرچ ہورہا ہے۔ اس سے پہلے ان کے خرچ ہوچکے ہیں اور حالت ابھی سے یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دنیا کے سامنے کشکول لے کر نکلنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ انگریز ڈپلومیسی میں امریکہ سے بہت بہتر ہے اور انگریز کی ڈپلومیسی میں صدیوں کی ٹریننگ کی وجہ سے ایک نفاست پائی جاتی ہے۔ اس لئے جب ہمارے فارن

سیکرٹری صاحب جرمنی گئے تو وہاں سے انہوں نے 7،6 سوملین کی جو Aid انکو دی اس کا اعلان کرتے وقت انہوں نے پہلا فقرہ ہی یہ کہا کہ دیکھو بھئی ! میں کوئی کشکول لے کر تو نہیں یہاں آیا تھا۔ میرے ہاتھ میں تو کوئی کشکول نہیں تھا۔ میرے دماغ میں تو Figure بھی کوئی نہیں تھی ۔کوئی اعداد نہیں تھے کہ اتنی رقم میں وصول کروں گا۔ یہ جرمن بھائی ہمارے بڑے مہربان ہیں۔ بہت اچھے لوگ ہیں ۔اچھی قوم ہے ۔انہوں نے دیکھا کہ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اپنے ان بھائیوں کی مشکل میں مدد دیں اور War Efforts میں ہم کچھ حصہ ڈالیں تو ہم شکریے سے قبول کرتے ہیں۔

ایڈورڈ ھیتھ نے کل رات کو اسی بحث میں حصہ لیتے وقت کہا کہ تمہارے جھوٹ کی اور مکاریوں کی حد ہوگئی ہے ۔تم نے قوم کو ساری دنیا میں بے عزت کر دیا ہے۔ کشکول ہاتھ میں پکڑ کے تم بھاگے پھرتے ہو اس مصیبت میں پڑنے کی ضرورت کیا تھی جس کو سنبھال نہیں سکتے جس کے لئے انگلستان کی عزت کو اور عظمت کو داغدار کر دیا ہے اور اب تم بھکاری بن گئے ہو۔ امریکن اس کے مقابل پر کورس (Coarse) یعنی اکھڑ قسم کے Politicians ہیں۔ کوئیل صاحب یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں جو امریکہ کے وائس پریذیڈنٹ ہیں اور ان کی جو ذہنی اور سیاسی قابلیتیں ہیں ان کے اوپر امریکہ کا اخبار نویس ہمیشہ ہنستا رہتا ہے اور مذاق اڑاتا رہتا ہے اس حصے کا تو میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ان کے آپس کے معاملات ہیں لیکن ان کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں اور یہ نہیں پتا لگتا کہ میں کس طرح بعض چیزوں پر پردے ڈالوں چنانچہ اپنے امریکہ کے مانگنے کو انہوں نے ایک اور نام دیا ہے۔ جیسے ہمارے پنجاب میں مشہور ہے کہ بعض ''ڈنڈا فقیر'' ہوتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ یہ کہیں کہ بھئی خدا کے واسطے کچھ بھیک ڈال دو۔ بھوکے مر رہے ہیں کچھ مدد کرو، رحم کرو، وہ ڈنڈا لے کر جاتے ہیں کہ دیتے ہو تو دو ورنہ ہم لاٹھی سے سر پھاڑ دیں گے۔ تو انہوں نے اپنا جو طریق کار پیش کیا ہے وہ ''ڈنڈا فقیر'' والا ہے۔ جب ان سے ایک اخباری نمائندے نے یا ٹیلی ویژن کے نمائندے نے سوال کیا کہ بتائیے آپ دنیا سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہا توقع ! ہم نے تو اب فیصلے کر لئے ہیں کہ فلاں سے اتنا وصول کرنا ہے فلاں سے اتنا وصول کرنا ہے فلاں سے اتنا وصول کرنا ہے اور ہم نے مانگنا تو نہیں۔ ہم ان کو بتائیں گے کہ یہ تم نے دینا ہے تو اس نے کہا کہ جناب! اگر وہ نہ دیں تو پھر کیا کریں گے۔ انہوں نے کہا نہ دیں گے تو پھر اتنا میں بتا دیتا ہوں کہ پھر امریکی تعلقات پر انحصار نہ

رکھیں۔ایک دبی ہوئی دھمکی تھی تو بہر حال اتنی بڑی قیمت دے رہے ہیں اور تمام عالم اسلام میں جو نام انہوں نے پیدا کیا تھا یکسر اس کو مٹا بیٹھے ہیں۔قریب ہی کے زمانے میں ایک وقت تھا جب کہ پاکستان عملاً امریکہ کا سیٹلائیٹ بن چکا تھا اور عوام الناس اس کو قبول کر چکے تھے۔ہر سیاست دان اپنے وقار اور عظمت کے لئے امریکہ کی طرف دوڑتا تھا اور عوام میں اس کے خلاف ردعمل ہی ختم ہو چکا تھا۔اب چند دنوں کے اندر اندر نفرت کی ایسی آگ بھڑکی ہے کہ لفظ امریکن وہاں گالی بن گیا ہے اور اسی طرح مسلمان ممالک سے برطانیہ نے اپنے تعلقات کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے اور بہت ہی لمبے عرصے سے جو نیک نام پیدا کیا تھا وہ نام مٹا دیا ہے تو یہ اتنی بڑی قیمت کیوں دے رہے ہیں کیوں نہ Linkage کو تسلیم کر لیا کہ اسرائیل کو کہتے کہ تم فلاں علاقہ خالی کر دو اور عراق فلاں علاقہ خالی کر دے گا۔بات وہیں ختم ہو جائے گی۔اس لئے ہمیں ان باتوں کا مزید تفصیل سے جائزہ لینا ہوگا کہ اس موجودہ لڑائی کے پس منظر میں کیا عوامل کام کر رہے ہیں۔یہ جو الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ ان کے مشترکہ مفادات ہیں جن کی خاطر یہ اس وقت عراق کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں اور کویت کی بحالی محض ایک بہانہ ہے۔اس کی بھی چھان بین کرنی ہوگی کہ کیا پہلے مشترکہ یا غیر مشترکہ علاقائی مفادات کی خاطر ان قوموں نے اسی قسم کا ردعمل دکھایا کہ نہیں۔

دوسرا جو الزام ہے کہ یہود کی خاطر ایسا کیا جا رہا ہے اس کی چھان بین کرنی ہوگی کہ جب بھی یہود اس علاقے میں مسلمان ریاستوں سے متصادم ہوئے ہیں یا اسرائیل کہنا چاہئے۔یہود میں تو بعض ایسے فرقے بھی ہیں جو اسرائیل کے خلاف ہیں بعض بڑے بڑے شریف النفس ایسے لوگ بھی ہیں جو اسرائیلی جارحیت کی کھل کر تنقید کرتے ہیں اور ان کی کارروائیوں کی کسی رنگ میں بھی تائید نہیں کرتے تو یہود نہیں کہنا چاہئے ، اسرائیل کہنا چاہئے کہ اسرائیل کا جب بھی تصادم ہوا ہے ان قوموں نے اس میں کیا کردار ادا کیا ہے اور کیوں اسرائیل کی ہر موقعہ پر تائید کی ہے اگر تائید کی ہے تو مذہبی تعصب اس میں کارفرما ہے یا محض مفادات ہیں۔اسرائیل کے قیام کی غرض وغایت کیا ہے کیوں اس کو ہر بڑی سے بڑی قیمت پر قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔یہ سارے سوالات ہیں جن کا جواب انشاء اللہ آئندہ خطبے میں پیش کروں گا اور جہاں سے اس تاریخ کی بحث کو چھوڑ رہا ہوں ، وہیں سے اٹھا کر آج تک کے حالات رونما ہونے والے بڑے بڑے واقعات آپ کے سامنے پیش کروں گا تا کہ

آپ کی یادداشت تازہ ہو جائے۔

اس تجزیے کے بعد پھر اگلے خطبے میں اگر وقت ملا یا اس کے بعد کے خطبے میں میں اسلامی نقطہ نگاہ سے ان مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ آج وقت زیادہ ہو چکا ہے۔ اس لئے اس بحث کو، اس خطاب کو سر دست یہاں ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ ہم بحیثیت غلامان محمد مصطفی ﷺ کو عالمی مسائل کا ایک ایسا حل پیش کرنے کی توفیق پائیں جس کی اندرونی طاقت ایسی ہو کہ اگر وہ اس کو قبول کریں تو بنی نوع انسان کو امن کی ضمانت ملے اور اگر قبول نہ کریں تو جو چاہیں کریں امن مہیا نہ کر سکیں۔ صحیح حل کے اندر ایک یہ طاقت ہوا کرتی ہے جو سچائی کی طاقت ہے۔ اگر کوئی انسان کسی صحیح مشورے کو قبول کرے تو اس کا فائدہ ہوتا ہے اور اگر رد کر دے تو اس کا نقصان ہوتا ہے۔ پس میں چونکہ اسلام کی نمائندگی میں بات کروں گا اس لئے یقین رکھتا ہوں کہ جو حل جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کیا جائے گا وہ ایسا حل ہے کہ جس کو تخفیف کی نظر سے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر قبول کرو گے تو اپنے فائدے کے لئے قبول کرو گے اور بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے بھی اور اگر رد کرو گے تو جو چاہے کوششیں کرو، دنیا سے تم فساد کو رفع دفع نہیں کر سکتے اور ایک کوشش کے بعد دوسری کوشش ناکام ہوتی چلی جائے گی اور ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ سر اٹھاتی چلی جائے گی اور ایک بدامنی کے بعد دوسری بدامنی انسانی معاشرے کو خون آلود کرتی رہے گی اور انسان کے دل کے امن اور سکون کو لوٹتی رہے گی۔ یہ میں یقین رکھتا ہوں کہ چونکہ میں خدا کے فضل کے ساتھ اسلامی حل پیش کروں گا اس لئے یہی صورت ہوگی۔ ان کو یا قبول کرنا ہوگا اور فائدہ اٹھانا ہوگا یا رد کرنا ہوگا اور نقصان کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔

جماعت احمدیہ سے میری درخواست ہے کہ یہ دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ میری ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کو تقویٰ پر قائم رکھے تا کہ میں تقویٰ کے نور سے دیکھ کر ان مسائل کا کوئی ایسا حل تجویز کر سکوں جن سے بنی نوع انسان کو امن کی ضمانت دی جا سکے۔